



## سوال

(519) نماز میں مخصوص آیات کا جواب دینا

## جواب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ عمر کتنا ہے کہ **أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْحَاكِمِينَ** اور **سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى** اور **فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ لُمُؤْمِنُونَ** وغیرہ آیات کا جواب جس طرح قاری کو دینا چاہیے اسی طرح سامع کو بھی دینا چاہیے اور زید کتنا ہے کہ ان آیات کا جواب صرف قاری کو دینا چاہیے سامع کو نہیں دینا چاہیے۔ پس ان دونوں سے کس کا قول حق و صواب ہے۔ **میںواتوجروا۔**

## الجواب بعون الوهاب بشرط صحة السؤال

و علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

الحمد للہ، والصلاة والسلام على رسول اللہ، أما بعد!

صورت مسنون عنہما میں عمر کا قول اقرب الی الصواب (حق سے زیادہ قریب) ہے یعنی آیات مذکورہ کا جواب جس طرح قاری کو دینا چاہیے، اسی طرح سامع کو بھی دینا چاہیے اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا بوقت قرآن آیتوں کا جواب دینا ثابت ہے اور آپ ﷺ کا قول و فعل امت کے لیے ہر وقت دستور العمل ہے تا وقتیکہ اس کی تخصیص کسی وقت خاص، یا شخص خاص یا حالت خاص کے ساتھ ثابت نہ ہو مثلاً ”رفع الیدین“ اور ”وضع الیدین علی الصدر“ (سینے پر ہاتھ باندھنا) اور ”رفع سبابہ فی التمشد“ (تمشید میں انگلی اٹھانا) اور ”جلسۃ استراحت“ اور ”تورک“ اور ”قبل افتتاح قرأت“ کے ”اللہ اکبر کبیرا والحمد للہ کثیرا سبحان اللہ بکرۃ واصلیا“ یا ”انی وجئت وھی للذی فطر السموات والارض“ یا ”اللہم باعد عینی و بین خطایا“ پڑھنا یا رکوع میں ”سُبْحٰنٌ قُدُّوسٌ رَبُّ الْمَلَائِکَةِ وَالرُّوحِ“ اور سجدہ میں ”سَجْدَکَ وَجْهِ وَعِظَامِی وَحُجِّی“ پڑھنا وغیرہ۔ یہ سب ایسے افعال ہیں جن کی مسنونیت میں کسی طرح کا شک نہیں ہو سکتا اور امت محمدیہ میں سے ہر شخص کے لیے یہ افعال مسنون ہیں، خواہ وہ شخص امام ہو یا مقتدی، خواہ منفرد ہو حالانکہ یہ کہیں ثابت نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے مقتدیوں کو ان امور کی تعلیم فرمائی ہو یا عام طور پر فرمایا ہو کہ جو شخص جب نماز پڑھے تو ایسا کرے پھر بھی یہ احکام ہر شخص کے لیے اسی وجہ سے عام رہے کہ قول و فعل۔ مجتہدین ﷺ تمام افراد امت کے لیے دستور العمل ہوتا ہے جب تک حدیث مرفوعہ سے ہی تخصیص ثابت نہ ہو: **قَالَ اللَّهُ تَعَالَى لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب: ۲۱)**

پس بناء بر تقریر هذا ان آیات کا جواب ہر شخص کو دینا چاہیے۔ عام ازیں کہ قاری ہو یا سامع، نماز میں ہو یا غیر نماز میں، امام ہو یا مقتدی یا منفرد **”إِتِبَاعًا لِغُلَامِ النَّبِيِّ ﷺ“**

اس کے بعد حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ نے ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور صحیح مسلم سے ان احادیث کو نقل کیا ہے جن سے آنحضرت ﷺ سے ان آیات کا جواب دینا ثابت ہوتا ہے۔ اس کے بعد آپ ”جامع ترمذی“ کے حوالہ سے وہ حدیث لائے ہیں جس میں آپ ﷺ نے صحابہ کی خاموشی پر جنوں کے جواب دینے کا تذکرہ فرمایا: اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو ”سورۃ رحمن“ کی مخصوص آیت کے جواب کی ترغیب دی، ان تمام روایات کو نقل کرنے کے بعد میاں صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

”اس حدیث ”ترمذی“ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قسم کی آیتوں کا جواب قاری یا مصلیٰ کے اعتبار سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کلام پاک کے معنی اور موقع کے لحاظ سے ہے۔ جب ہی تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سکوت پر اعتراض فرمایا: اور جنات کے جواب دینے کو مدحیہ طور پر ذکر فرمایا: حالانکہ آپ ﷺ نے اس سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس جواب کی تعلیم نہیں فرمائی تھی۔ پس معلوم ہوا کہ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی جن جن آیات کا جواب دیا ہے وہ اُس خصوصیت سے نہیں کہ آپ ﷺ امام یا قاری تھے بلکہ ان آیتوں کا معنی اور موقع ہی ایسا ہے کہ جب وہ آیت پڑھی جائے، تو پڑھنے والا اور سننے والا، اس کا مناسب جواب، جو احادیث سے ثابت ہو، دے۔

اس کے بعد حضرت صاحب نے اپنی اس تقریر کی تائید میں جامع صغیر کی شرح، شرح صحیح مسلم اور کتاب الاذکار للنووی کی بعض عربی عبارات تحریر فرمائی ہیں جنہیں طوالت کے خوف سے حذف کر رہے ہیں۔ ان عبارات کا جوہری مفہوم یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا یہ قول **أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَدْرِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ** اور **أَلَيْسَ اللَّهُ بِحَكِيمٍ الْعَالَمِينَ (التين: ۸)** تو ”علیٰ“ کہے۔ کیونکہ ان آیات میں سوال کیا گیا ہے جس کا جواب دینا چاہیے اور خطاب کا حق ہے، کہ مخاطب اس کا مناسب جواب دے۔ اگر نہ دے گا تو سامع غافل اور بے خبر تصور ہو گا یا جیسے کوئی جانور ہے جو آواز تو سنتا ہے لیکن مطلب نہیں سمجھتا یا کسی اندھے، گونگے، بہرے کی طرح جسے کچھ سمجھ نہ آئے۔ یہ حالت بہت بُری حالت ہے۔ (مفہوم عبارت نقل کردہ میاں صاحب)

اس ساری تحقیق کا خلاصہ یہ ہے، کہ مذکورہ آیات کا جواب قاری اور امام کی طرح سامع اور مقتدی کے لیے بھی جائز اور مستحب ہے اگرچہ واجب کسی پر نہیں۔ بعض نوجوان اہل علم ایسے مسائل میں تشدد پراثر آتے ہیں اور پُرسکون ماحول میں توخُش اور ارتعاش پیدا کرنا وچہ افکار خیال کرتے ہیں۔ یہ روش سلف کے تعامل کے قطعی خلاف ہے۔ ضعیف حدیثوں سے وجوب تو نہیں۔ استنباط بہر حال ثابت ہو جاتا ہے اور جہاں دلائل متعارض ہوں، وہاں تطبیق کے علاوہ توفیق کا عمل بھی مناسب ہوتا ہے اور دلائل متعارضہ کا حق یہی ہے کہ مسئلہ میں وسعت بہنے دی جائے، اور کسی کو کوئی خاص اور معین صورت اختیار کرنے پر نہ مجبور کیا جائے، اور نہ ہی دوسری صورت اپنانے والوں پر طعن و تشنیع کی جائے اور نہ ہی فریقین سے کسی کو بدعتی یا تارک حدیث کہا جائے۔ کیونکہ سلامتی کی راہ یہی ہے۔ (ہفت روزہ اہل حدیث: ۲۰/ اکتوبر۔ ۳ نومبر ۱۹۷۸ء)

### تعاقب از مولانا حافظ ثناء اللہ خان صاحب

#### فروعی مسائل میں اہل حدیث کا طرز فکر و عمل:

مؤقر جریدہ ہفت روزہ ”اہل حدیث“ لاہور مؤرخہ ۲۰/ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں قرآنی آیات کے جواب کے سلسلہ میں میری رائے کے ساتھ، ہمارے محترم دوست مدیر اعلیٰ اہل حدیث نے اپنی مخالفانہ رائے کا اظہار بھی ضروری سمجھا ہے، اور اس کے لیے انھوں نے جماعت اہل حدیث کی دو مایہ ناز ہستیوں کے فتاویٰ کی اشاعت بھی کی ہے، تاکہ لپنے مدعا کو تقویت دے سکیں۔

جہاں تک ان مبارک ہستیوں کے عزت و احترام اور علم و فضل اور اعلیٰ مقام کا تعلق ہے، ہمیں ان سے کوئی نسبت نہیں، لیکن موصوف مدیر اعلیٰ نے ان کے فتویٰ کو جس انداز میں شائع کیا ہے اور اس ضمن میں اپنی طرف سے جو اصول بحث (ضعیف حدیث کے قابل عمل ہونے کی) اٹھائی ہے۔ موجودہ علمی انحطاط کے دور میں وہ کئی فتوؤں کا دروازہ کھول سکتی ہے، اس لیے میں نے مناسب سمجھا، کہ کم از کم اس بارے میں اہل حدیث کے انداز فکر کی وضاحت کر دوں۔ کیونکہ اہل حدیث کا بیج فکر مخصوص ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی مسئلہ میں اہل حدیث علماء کی دور رائے ہوں۔ لیکن اہل حدیث کا مخصوص فکر اگر اپنے امتیازات کھو بیٹھے، تو پھر اس مکتب فکر کے وجود کا جواز ہی باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ بعض موقعوں پر عامۃ الناس علمائے اہل حدیث کی مختلف آراء دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں اور اس تذبذب میں پڑ جاتے ہیں، کہ اس میں سے کون سا مسلک اہل حدیث کا ہے، حالانکہ مسلک اہل حدیث پیش آمدہ مسائل کے حل میں صرف ایک مخصوص طرز عمل سے واسطہ رکھتا ہے۔ جس کی حفاظت علماء اہل حدیث پر فرض ہے۔ ہمارے نزدیک آراء کے باہمی تفاوت کی زیادہ اہمیت نہیں۔ طوالت سے بچنے کے لیے ہم مثالیں پیش کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ غالباً مدیر اعلیٰ کو بھی ہمارے اصل اصول سے اختلاف نہیں ہوگا۔

اس تمہید کے بعد ہم لپنے جائزہ کو ”اہل حدیث“ کے علمی اسلوب کی وضاحت کی غرض سے صرف دو نکتوں پر محدود رکھیں گے۔

اولاً: مدیر اعلیٰ کا یہ فرمان محدثین کے نزدیک کہاں تک درست ہے کہ:

”ضعیف حدیثوں سے وجوب تو نہیں، استحباب بہر حال ثابت ہو جاتا ہے۔“

ثانیاً: مسئلہ مذکورہ کی وضاحت کے لیے محترم بزرگوں کے فتوؤں کی اشاعت کا انداز تقلیدی تو نہیں ہے، جب کہ خود ہی یہ بزرگ غیر منقسم ہندوستان میں مقلدین کے خلاف صفت آراء رہے۔ شیخ الکل میاں صاحب رحمہ اللہ نے ”معیار الحق“ کتاب لکھی اور حضرت الاستاذ محدث روپڑی رحمہ اللہ کی بیشتر تصانیف کا محور یہی موضوع رہا۔ پہلے نکتہ کے لیے ہم اہل حدیث کے منتقدین اور متاخرین، راسخین فی العلم کے چند ایک ارشادات کا مختصر ذکر ہی کافی سمجھتے ہیں۔ ورنہ اس موضوع پر ان بزرگوں نے اس قدر تفصیلی بحثیں کی ہیں کہ ایک مستقل تصنیف ہی اس کی متحمل ہو سکتی ہے اور اس موضوع پر (ان شاء اللہ) کسی فرصت میں ایک مقالہ ہدیہ ناظرین کروں گا۔ فی الحال ائمہ کے چند ارشادات پیش خدمت ہیں:

اصول حدیث کی مشہور کتاب ”قواعد التحدیث“ میں علامہ جمال الدین قاسمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’فقد حكى فيه عن جماعة من الأئمة أنهم لا يرون العمل بالحدیث الضعیف مطلقاً، كابن معین، والبخاری، ومسلم، وأبي بكر بن العربي الفقيه، وغيرهم، ومثم ابن حزم‘

یعنی ”ائمہ اہل حدیث کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے، کہ ضعیف حدیث پر عمل مطلقاً ناجائز ہے (خواہ مسئلہ وجوبی ہو یا استحبابی) ان میں سے ابن معین، بخاری، مسلم، ابو بکر بن العربي رحمہم اللہ وغیرہم ہیں، ابن حزم رحمہ اللہ کی بھی یہی تحقیق ہے۔“

شیخ الاسلام ابن تیمیہ ”القاعدة الجلیاتہ“ (ص: ۴) میں فرماتے ہیں:

’ولم یقل أحد من الأئمة إنه يجوز أن يُجمل الشيء واجباً، أو مستحباً بحدیث ضعیف۔ ومن قال بهذا: فقد خالف الإجماع‘

یعنی ”ائمہ میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ کسی ضعیف حدیث سے کسی شے کو واجب یا مستحب قرار دینا جائز ہے۔ وہ اجماع کی مخالفت کرتا ہے۔“

گویا مدیر اعلیٰ کی یہ بات کہ ”ضعیف حدیثوں سے وجوب تو نہیں استحباب بہر حال ثابت ہو جاتا ہے۔“ ائمہ اہل حدیث کے اجماع کے خلاف ہے۔ ہند میں اہل حدیث انداز فکر کے مشہور نقیب نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ اپنی عربی تفسیر ”فتح البیان فی مقاصد القرآن“ کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

’أخطأ من قال إنه يجوز التسائل في الأحاديث الواردة في فضائل الأعمال‘

یعنی وہ شخص غلطی پر ہے، جو عقیدہ رکھے کہ فضائل اعمال میں ضعیف احادیث کو بھی لینا جائز ہے۔

چونکہ مدیر اعلیٰ کو یہ غلطی اہل الرائے کے بعض علماء کے طرز عمل سے لگی ہے۔ اس لیے محدثین کے اس مسلک کی وضاحت ہم ان ہی کے حوالہ سے پیش کیے دیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا عبد الحئی لکھنوی اپنی تصنیف ”الاجوبۃ الفاضلہ“ میں مشہور محقق جلال الدین الدوانی رحمہ اللہ سے نقل فرماتے ہیں:

’إنفقوا على أن الحدیث الضعیف لا یثبت به أحكام الشرعیة۔ ومنها الاستحباب‘

یعنی ”محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ ضعیف حدیث سے کوئی حکم شرعی (وجوب، حرمت، استحباب کراہت اور اباحت) ثابت نہیں ہوتا۔ ان میں سے استحباب بھی ہے۔“

عالم اسلام کے مشہور محدث علامہ ناصر الدین البانی متذکرہ بالا مغلطے (بعض ائمہ حدیث ضعیف حدیث سے احتجاج میں تساہل روا رکھتے ہیں) کا ازالہ کرتے ہوئے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں:



‘وَمَنْ نَقَلَ عَنْ أَحَدِنَا كَانَ مَكْتُوبًا بِالْحَدِيثِ الضَّعِيفِ الَّذِي لَيْسَ بِصَحِيحٍ وَلَا حَسَنٍ، فَهَذَا غَلَطٌ عَلَيْهِ الْقَاعِدَةُ الْجَلِيلَةُ، ص: ۸۵

یعنی جس نے امام احمد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے، کہ وہ ضعیف حدیث سے بھی دلیل پکڑتے ہیں۔ اس نے آپ پر غلط الزام لگایا ہے۔“

اور علامہ احمد محمد شاکر ”الباعث الخیث“ (ص: ۱۰۱) میں لکھتے ہیں:

‘وَأَنَا مَا قَالَهُ الْإِمَامُ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ، وَعَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ مَهْدِيٍّ، وَعَبْدُ اللَّهِ بْنُ الْبَارِكِ، إِذَا رَوَيْنَا فِي الْحَلَالِ، وَالْحَرَامِ - شَدَدْنَا - وَإِذَا رَوَيْنَا فِي الضَّعَائِلِ، وَنُحِبُّهَا - تَسَابَلْنَا - فَأَمَّا يُرِيدُونَ بِهَذَا الرَّجْحِ (وَاللَّهُ أَعْلَمُ) أَنَّ التَّسَابُلَ إِثْمَانِي الْأَخْبَاطِ بِالْحَدِيثِ الْحَسَنِ الَّذِي لَمْ يَصِلْ إِلَى دَرَجَةِ الضَّعْفِ - فَإِنَّ الْأَصْلَاحَ مِنَ التَّفَرُّقَةِ بَيْنَ الصَّحِيحِ، وَالْحَسَنِ، لَمْ يَكُنْ فِي عَصْرِهِمْ مُسْتَفْرَفًا وَأَصْحَابًا، بَلْ كَانَ أَكْثَرُ الْمُتَقَدِّمِينَ لَا يُصَيِّفُ الْحَدِيثَ إِلَّا بِالضَّعْفِ - أَوِ الضَّعْفِ فَقَطْ -‘

یعنی احمد بن حنبل، عبدالرحمن بن مہدی اور عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کے اس قول، کہ حرام اور حلال کے بارہ میں مروی حدیث میں ہم سختی کرتے ہیں اور فضائل اعمال کے بارہ میں ہم نرمی کرتے ہیں کا مضموم یہ ہے، کہ ان کی نرمی صرف حسن حدیث قبول کرنے تک تھی۔ کیونکہ ان کے زمانہ میں ابھی صحیح اور حسن کا مروجہ فرق نہ تھا۔ بلکہ اکثر متقدمین حدیث کو صحیح کہتے تھے یا ضعیف۔ یعنی وہ حدیث کی صحیح اور ضعیف صرف دو قسمیں کرتے تھے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور مشہور محدث علامہ احمد محمد شاکر رحمہ اللہ کی توجیہات پیش کرنے کے بعد شیخ البانی ایک اور توجیہ اپنی طرف سے بھی پیش کرتے ہیں، وہ یہ کہ ان کی مذکورہ نرمی دراصل ان کا یہ رواج تھا، کہ وہ ضعیف احادیث کو باسند روایت کرتے تھے۔ کیونکہ اس زمانہ میں ضعیف حدیث کو باسند نقل کرنا، اس کی تصحیح یا تضعیف سے کفایت کرنا تھا۔ (ملخصاً)

دراصل قرآنی آیات کے جواب کے بارے میں اس کا استنباب قاری تک محدود رکھنے کے حق میں میری ترجیحی رائے احادیث کے معیار پر مبنی ہے۔ میں نے اپنے جواب میں اس بارے میں وارد احادیث میں صحت پر بحث کر کے لکھا ہے، کہ صحیح احادیث میں سامع مقتدی یا غیر مقتدی کا جواب ثابت نہیں۔ اس لیے میری نظر میں اولیٰ یہ ہے، کہ اس حکم استنباب کو صرف قاری پر مصور رکھا جائے۔ یہ بات لکھتے ہوئے میرے سامنے ایک تو احادیث کا معیار تھا، کہ سامع کے بارے میں کوئی صحیح حدیث موجود نہیں، جب کہ ہمارے ہاں اہل حدیث میں یہ عمل عام ہو کر عدم توازن کا شکار ہو گیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ قرآن کی عام آیت رحمت و عذاب پر تو خاموش بستے ہیں۔ لیکن چند مخصوص صورتوں میں جواب کو سنت قرار دے دیا ہے۔ یہ مروجہ طریقہ سلف میں موجود نہ تھا۔ اس لیے میں نے یہ رواج مروج سمجھا۔ تیسری وجہ میرے سامنے فقہاء محدثین کا یہ اصول تھا، کہ عبادت میں اصل ”حظر“ (مانعت) ہے۔ چنانچہ ہمارے جن بزرگوں نے سامع کو بھی قاری پر قیاس کیا ہے، انھوں نے اس مذکورہ اصول سے اس مسئلہ میں بے اعتنائی کی ہے۔

چوتھی وجہ چند احادیث ہیں، جو نماز کی حالت میں مقتدی کی خاموشی کو کم از کم احتیاطی حیثیت تو دے دیتی ہیں مثلاً حدیث **لَا تَفْطَلُوا إِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ** ”سنن ابی داؤد، باب مَنْ تَرَكَ الْقِرَاءَةَ فِي صَلَاتِهِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ، رقم: ۸۲۳“ اور **وَإِذَا قُرِئَ فَانصتوا** وغیرہ۔ یعنی سورت فاتحہ کے علاوہ مقتدی خاموشی اختیار کرے۔ قرآن کی آیت **وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا، وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (الاعراف: ۲۰۴)** کا بھی یہی معنی ہے۔

پانچویں وجہ جو حقیقت میں فتویٰ میں مذکور حضرت شیخ الکل میاں صاحب کے اصول (قول و فعل) کی صحیح تعبیر ہے۔ بیغمبر تمام افراد امت کے لیے دستور العمل ہوتا ہے، جب تک حدیث مرفوعہ میں ہی تخصیص ثابت نہ ہو۔ وہ یہ کہ نبی ﷺ کی اتباع صرف اس معنی میں جمیع افراد امت کے لیے عام ہے۔ جب فرد کی حالت بھی وہی ہو، یعنی آپ نے اگر کوئی عمل قاری کی حیثیت سے کیا ہے، تو یہ امت کے سب قاریوں کے لیے ہوگا۔ علماء اصول نے عموماً فعل اور **”العبرة بعموم اللفظ“** (عموم لفظ کے معتبر ہونے) کی مباحث میں اس نکتہ کی وضاحت کی ہے۔ مثلاً قرآن کی آیت **وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ (الاعراف: ۲۰۴)** سے کوئی شخص یہ عمومی حکم نکالے کہ نماز سے باہر ایک شخص قرآن کی تلاوت کر رہا ہو، تو اس کے قریب دوسرے تلاوت کرنے والے سب خاموش ہو جائیں، تو یہ عموم غلط ہوگا۔

ہمارا خیال ہے کہ مدیر اعلیٰ موصوف بھی اس حکم کو مقتدی اور عام سامع تک نہیں سمجھتے ہوں گے۔ اس روشنی میں ہماری ترجیحی رائے پر بھی غور فرمائیں، کہ ہماری احتیاط کتنا وزن رکھتی ہے۔



اب ہم دوسرے نکتہ پر توجہ دلانا مناسب سمجھتے ہیں۔ جماعت اہل حدیث پاک و ہند میں حضرت شیخ الکل اور حضرت الاستاذ محدث روپڑی وغیرہ بزرگوں کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا ثمر ہے۔ ان بزرگوں کی کتاب و سنت کے احیاء اور تقلید سے اجتناب کے لیے کامیاب تحریک کے امتیازات آہستہ آہستہ پس پشت ڈالے جا رہے ہیں۔ ان بزرگوں نے تو ”مذہب اربعہ“ کے مذہبی تعصب سے نجات دلائی تھی۔ لیکن ہم لوگ ان کی تقلید کے درپے ہو کر پانچواں تقلیدی مذہب اختیار کر رہے ہیں۔ اور آج کل زور اس بات پر دیا جاتا ہے، کہ ہم ان بزرگوں کے ہر جزوی مسئلہ کو بھی تسلیم کریں۔ حالانکہ اہل حدیث کا مسلک چند فروعی مسائل کی مخصوص تعبیر نہیں ہے۔ بلکہ اہل حدیث کتاب و سنت کی سلفی بیخ پر فہم و تعبیر کا نام ہے۔ کسی مخصوص مسئلہ میں اہل حدیث کی دو یا زیادہ آراء سے مسلک اہل حدیث پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ اس لیے ہم نے بھی پیش آمدہ مسئلہ میں کوئی سخت رویہ اختیار نہیں کیا تھا۔ بلکہ استنباب کے دو پہلوؤں میں سے ایک کو اولیٰ قرار دیا تھا۔ یعنی قرآنی آیات کا جواب صرف استنبابی مسئلہ ہے۔ قاری کے جواب کے حق تک تو ہم بھی مستتب سمجھتے ہیں۔ لیکن سامع کے لیے ضعف احادیث کی وجہ سے جواب کو احتیاط کے منافی سمجھتے ہیں۔ بہت سے ائمہ نے اس حکم کو مزید محدود کیا ہے۔ بعض تو اس کے لیے صرف نفل نماز کی شرط لگاتے ہیں اور بعض صرف منفرد کے لیے جائز سمجھتے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! المعنی لابن قدامہ جلد اول، ص: ۵۵۰، سبل السلام جلد اول، ص: ۲۸۶، وغیرہ۔ (اہل حدیث، الاسلام، الاعتصام)

### مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف کا تبصرہ

اس سلسلے میں ہمیں دو گزارشات کرنی ہیں۔ اول حدیث ضعیف کے سلسلے میں، وہ یہ کہ فاضل مضمون نگار کی حدیث ضعیف کے متعلق بحث سے معلوم ہوتا ہے، کہ حدیث ضعیف مطلقاً ناقابل اعتبار ہے۔ لیکن یہ اطلاق محل نظر ہے۔ ہم موصوف کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے اس فیصلے کی طرف توجہ دلائیں گے، کہ انھوں نے تین شرطوں کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ ”تدریب الراوی“ وغیرہ میں ہے:

’ذکر شیخ الإسلام ثلاثہ مشروطاً أحدها: أن يكون الضعيف غير شديد۔ فيخرج من الفرد من الكذابين، والشميعين بالكذب، ومن فحش غلط۔ نقل العلاءي الاتفاق عليه۔ الثاني: يندرج تحت أصل معمول به۔ الثالث: أن لا يعتقد عند العمل به ثبوت، بل يعتقد الاحتياط تدریب الراوی، ص: ۱۹۶، طبع مدینہ منورہ: ۱۹۵۹ء

یعنی شیخ الاسلام (حافظ ابن حجر رحمہ اللہ) نے حدیث ضعیف کے لیے تین شرطیں ذکر کی ہیں۔ (۱) ضعف شدید قسم کا نہ ہو، یعنی راوی کذاب یا متهم بالکذب اور خطائے فاحش کا مرتکب نہ ہو۔ اگر کسی روایت میں اس انداز کا راوی ہوگا، تو یہ ضعف شدید ہوگا، جس کی وجہ سے روایت پایہ اعتبار سے ساقط ہو جائے گی۔ (۲) بیان کردہ روایت کی کوئی ایسی اصل (بنیاد) موجود ہو جو معمول بہ ہو (۳) عمل کرتے وقت روایت کے ثبوت کا اعتقاد نہ رکھے، بلکہ احتیاط کے طور پر اس پر عمل کو جائز سمجھے۔

تیسری شرط کا مطلب یہ ہے، کہ اگر حدیث ضعیف میں مذکور عمل کی فضیلت کی کوئی اصل صحیح بھی موجود ہو، تو ایسی ضعیف قابل عمل ہو سکتی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ فاضل موصوف کے استاذ علامہ ناصر الدین البانی (رحمہ اللہ) جو ضعیف احادیث کے معاملہ میں کافی تشدد بتاتے جاتے ہیں، اس توجیہ سے شاید ان کو بھی انکار نہ ہو۔ جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا بھی رجحان اسی طرف ہے۔ فاضل تنقید نگار نے حضرت الامام کی جس عبارت کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے۔ وہ عبارت یہ ہے۔ (یعنی ایک طویل بحث کے سلسلے میں)

’لكن أحمد بن حنبل وغيره من العلماء يجوزون أن يروى في فضائل الأعمال ما لم يعلم أنه ثابت إذا لم يعلم أنه كذب۔ وذلك أن العمل إذا علم أنه مشروع بدليل شرعي وروى في فضائل الأعمال ما لم يعلم أنه كذب۔ جازان يكون الثواب حقا۔ ولم يقل أحد من الأئمة أنه يجوز أن يجعل الشيء واجباً، أو مستحباً، بحديث ضعیف۔ ومن قال بذا، فقد خالف الإجماع وبذا كما أنه لا يجوز أن يخرم شيء إلا بدليل شرعي لكن إذا علم تحريمه، وروى حديث في وعيد الفاعل له۔ ولم يعلم أنه كذب جازان يروى في جواران يروى في الترغيب والترهيب، ما لم يعلم أنه كذب إلى آخر ما قال التوسل، ص: ۸۴، ۸۵

دوسری بات زیر بحث مسئلہ کے متعلق ہے۔ سواؤلاً ہمارے ہاں اس رواج کا، کہ مقتدی بلند آواز سے یہ ”جوابات“ دیتے ہیں، کوئی جواز معلوم نہیں ہوتا۔ ثانیاً مولانا عبدالرحمن مبارکپوری نے ”تحفۃ الاحوذی“ (ص: ۲۱۵، ج: ۴) میں زیر حدیث متعلقہ جواب آیت ”سورہ والتین“ فرمایا ہے:



’والحدیث یُدلُّ علی أن من یقرُّ بِهذِهِ الْآیَاتِ یُسْتَحَبُّ لَهُ، أَنْ یَقُولَ تِلْكَ الْكَلِمَاتِ سَوَاءً كَانَ فِي الصَّلَاةِ أَوْ خَارِجًا - وَأَنَا قَوْلُنَا لِلْمُقْتَدِرِ خَلْفَ الْإِمَامِ فُلْمِ أَدْنَى عَلَى حَدِيثٍ يُدَلُّ عَلَيْهِ - اُنْتَهَى

یعنی اس حدیث سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ قاری کا اَلَيْسَ اللّٰهُ بِحَكِّمٍ الْعَاطِمِينَ (التین: ۸) کے بعد ’علی وانا علی ذاک من الشہدین‘ کہنا مستحب ہے۔ وہ قاری نماز کے اندر ہو یا نہ ہو۔

لیکن امام کے پیچھے مقتدی کا کہنا جہاں تک مجھے علم ہے، کسی حدیث میں نہیں آیا ہے۔ مولانا عبید اللہ صاحب مبارکپوری مدظلہ کا بھی فیصلہ یہی ہے:

’والحدیث یُدلُّ علی أن من یقرُّ بِهذِهِ الْآیَاتِ یُسْتَحَبُّ لَهُ، أَنْ یَقُولَ تِلْكَ الْكَلِمَاتِ سَوَاءً كَانَ فِي الصَّلَاةِ أَوْ خَارِجًا - وَأَنَا قَوْلُنَا لِلْمُسَامِحِ الْمُقْتَدِرِ، أَوْ غَيْرِ الْمُقْتَدِرِ، فُلْمِ أَقْفَ عَلَى حَدِيثٍ مَرْفُوعٍ صَرِيحٍ يُدَلُّ عَلَى ذَلِكَ لِح “مرعاة المفاتيح، ص: ۶۸، ص: ۶۲۸ - جلد اول طبع المكتبة السلفية لاہور“

رہی وہ بات جو مرعاۃ میں متاخرین شافعی فقہاء سے نقل کی گئی ہے تو اس کی حیثیت نکتہ آفرینی سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ حذا ما عندنا واللہ اعلم (ہفت روزہ الاعتصام، ص: ۱۲۷ / دسمبر ۱۹۷۰ء)

### مولانا عطا اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کے تبصرے پر جواب تبصرہ

(مولانا حافظ ثناء اللہ خاں صاحب)

ضعیف خبر لجماعت کی رو سے ناقابل اعتبار ہے۔ میں نے موقر جریدہ اہل حدیث لاہور مجریہ ۱۲۰/ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں بعض قرآنی آیات کے جواب دینے کے مسئلہ پر قاری کے لیے اس کا استحباب صحیح حدیث سے ثابت کیا تھا اور اس کے ضمن میں سامع کے لیے وارد روایات کا ضعف بھی بیان کیا تھا۔ آخر میں اپنی ترجمی رائے میں یہ اظہار خیال کیا تھا، کہ سامع کے لیے جواب نہ دینے میں احتیاط ہے۔ کیونکہ اس بارے میں احادیث ثابت نہیں ہیں۔ اس فتوے کی اشاعت کے لیے مدیر اعلیٰ ’اہل حدیث‘ نے اپنی مخالفانہ رائے کے لیے یہ اصول پیش کیا تھا کہ ’ضعیف حدیثوں سے وجوب تو نہیں استحباب بہر حال ثابت ہو جاتا ہے۔‘ جس پر میں نے فروعی مسائل میں اہل حدیث کے طرز فکر و عمل کی وضاحت کے لیے تبصرہ مناسب سمجھا اور اس اصولی بحث پر اپنا آرٹیکل اشاعت کے لیے مختلف رسائل کو بھیجا۔

ہفت روزہ ’الاسلام‘ گوجرانوالہ نے اسے بیغ نہ شائع کیا اور ہفت روزہ ’الاعتصام‘ لاہور نے بھی عنوان تبدیل کر کے اس کی اشاعت کی۔ ہم واجب الاحترام حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف کے انتہائی شکر گزار ہیں، کہ انھوں نے اس پر اپنی طرف سے ملاحظیات بھی پیش فرمائے، اور نفسِ مستدک نہ صرف پُر زور تائید کی، بلکہ اس سلسلہ میں جماعت اہل حدیث کے دو مایہ ناز بزرگوں کے تائیدی کلمات بھی نقل فرمائے۔ اگر صرف فتویٰ کی تائید ہمارا مقصود ہوتی تو ہمارے لیے حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف جیسے بزرگ کی اس مسئلہ پر حتمی رائے کافی تھی، جو ہمارے لیے موقف سے بڑھ کر تائید ہے، لیکن ہمیں یہ یقین نہیں آ رہا کہ محترم موصوف اہل حدیث مکتب فکر کے امتیازی اصولی مسئلہ کے بارے میں محدثین کبار سے اختلاف رائے فرما سکتے ہیں۔ کیونکہ زیر بحث مسئلہ کی تائید کے ساتھ ہی ہمارے اٹھائے ہوئے اصولی مسئلہ پر انھوں نے تعاقب فرمایا ہے۔ چنانچہ موصوف نے اولاً موضوع بحث کو کچھ بدل دیا ہے۔ ہمارے زیر نظر صرف یہ جائزہ لینا تھا (کہ ضعیف حدیث سے وجوب تو نہیں استحباب بہر حال ثابت ہوتا ہے) اہل حدیث کا انداز فکر ہے یا نہیں! لیکن محترم موصوف اس موضوع کو بدل کر فرماتے ہیں: کہ راقم (ثناء اللہ) کے نزدیک حدیث ضعیف مطلقاً ناقابل اعتبار ہے۔ لیکن مولانا موصوف کی رائے میں یہ اطلاق محل نظر ہے۔ چونکہ ہم پاکستان میں محدثین کا طرز عمل و فکر کا انخطاط دیکھ رہے ہیں۔ اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کی وضاحت مناسب طور پر ہو جائے لہذا ہم پہلے یہ واضح کریں گے کہ محققین ائمہ حدیث شرعی احکام کے ثبوت میں ضعیف حدیث کا اعتبار نہیں کرتے۔

چونکہ استحباب پانچ شرعی تکلیفی احکام میں سے ایک حکم ہے۔ لہذا یہ کسی ضعیف خبر سے ثابت نہیں ہوتا۔ پھر یہ بتائیں گے کہ جن ائمہ حدیث نے ضعیف حدیث کی روایت یا اس پر عمل کے لیے چند شروط لگائی ہیں، ان کا اصل مقصد اور ما حاصل کیا ہے اور ہم کس طرح آج انخطاط علمی کے دور میں ان شروط کا اہتمام نہ رکھ سکتے کی وجہ سے حدیث کے سلسلہ میں نہ صرف غٹ و سمن کی تمیز ختم ہو گئی ہے۔ بلکہ لوگ ہر طرح کی ضعیف خبر پر عمل سے بڑھ کر اسے عقیدہ میں بھی قابل استدلال ٹھہراتے ہیں۔



اب ہم پہلے نکتہ کو لیتے ہیں، کہ حدیثِ ضعیف سے کوئی حکم شرعی تکلیف (وجوب، استحباب، اباحت، کراہت، حرمت) ثابت نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں ہم جہادہ محدثین کے بعض اقوال اپنے پہلے تبصرہ میں پیش کر چکے ہیں۔ دیگر بے شمار تائیدات اور وضاحتوں سے علم حدیث کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ہم ان شاء اللہ کسی دوسری فرصت میں وہ تفصیلاً عرض کریں گے۔ فی الحال اس نکتہ پر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے محدثین کا جو اجماع ہم نے نقل کیا تھا، اُس کے متعلق وضاحت کرنا کافی ہوگا۔ کیونکہ محترم مولانا عطا اللہ صاحب حنیف نے غلطی سے یہی عبارت ضعیف حدیث کے قابل اعتبار ہونے کے لیے پیش کر دی ہے، اور اس عبارت کا کچھ زیادہ حصہ نقل فرمایا ہے، کہ شاید ضعیف حدیث سے استحباب کے لیے گنجائش نکل سکے۔ لیکن اصل رائے جس سے ضعیف حدیث کے ناقابل اعتبار ہونے کا حتمی فیصلہ ہوتا ہے، وہ پھوڑ دی ہے۔ لہذا اب ہم عبارت کو وہاں سے شروع کرتے ہیں، عبارت یوں ہے:

‘وَلَا يَجُوزُ أَنْ يُعْتَدَرَفِي الشَّرِيْعَةِ عَلَى الْأَحَادِيثِ الضَّعِيْفَةِ اَلَّتِي لَيْسَتْ ضَعِيْفَةً، وَلَا حَسْبَهُ، لَكِنْ اَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ رَحِمَهُ اللهُ، وَغَيْرُهُ مِنَ الْعُلَمَاءِ... الخ ۱۱ التوسل، ص: ۸۵، ۸۴

مولانا محترم نے ترجمہ نہیں دیا۔ لہذا ہم تفہیم کے لیے عبارت مکمل طور پر نقل کیے دیتے ہیں، تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ محدثین کا اتفاق اور اجماع کیا ہے اور اختلافی نکتہ کیا ہے؟

”شریعت میں صحیح اور حسن احادیث کے علاوہ ضعیف پر اعتماد جائز نہیں، لیکن احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ بعض علماء نے اعمال کی فضیلت کے ذکر میں بعض ایسی روایات کے صرف نقل کی اجازت دی ہے، جن کے صحت کے درجہ تک پہنچنے کا علم نہیں ہو سکا، بشرطیکہ ان کا تھوٹ بھی نامعلوم ہو، وجہ یہ ہے کہ جب اصل عمل تو صحیح دلائل سے مشروع ہو اور اس مشروع عمل کی فضیلت کے بارے میں ایسی حدیث (ضعیف، خفیض) ذکر کر دی گئی، جس کا تھوٹ ہونا معلوم نہیں تو (نفس عمل) مشروع ہونے کی بناء پر ثواب تو درست ہے (البتہ ضعیف حدیث سے ثواب کی کیفیت یا کمیت کا تعلق ہی باقی رہ جائے گا، جو اسرا سیلیات کے درجہ کی بات ہوگی۔ ظاہر ہے کہ جب اسرا سیلی روایات شرع محمدی کے خلاف نہ ہوں، تو وعظ و نصیحت میں ان کا ذکر جائز ہے۔ لیکن مسائل میں ان کا کسی درجہ اعتبار نہیں) فرماتے ہیں: کہ کوئی امام (بشمول احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ) یہ نہیں کہتا کہ ضعیف احادیث کا اعتبار کر کے کوئی بات واجب یا مستحب قرار دینی جائز ہے اور جو شخص (ضعیف حدیث کے کسی درجہ اعتبار کی) یہ بات کرتا ہے، وہ لجماعت کی مخالفت کرتا ہے (خطوط وحدانی میں مذکور باتیں بھی ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اگلی عبارت کا مضموم ہیں)

متذکرہ بالا عبارت سے حسب ذیل باتیں حاصل ہوتی ہیں۔

۱۔ صحیح اور حسن حدیث کے علاوہ ضعیف احادیث پر اعتبار جائز نہیں۔

۲۔ پوری امت اس بات پر اجماع کر چکی ہے، کہ ضعیف حدیث سے وجوب یا استحباب پر استدلال جائز نہیں، اور ائمہ سے اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔

۳۔ محدثین کے نزدیک معرض استدلال اور روایت میں ضعیف احادیث کا اعتبار نہیں لیکن احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ بعض علماء چند شروط سے فضائل اعمال میں ان کی صرف روایت جائز سمجھتے ہیں۔

لیکن روایت حدیث کے بارے میں بھی محدثین کا مسلک صحیح مسلم کے ”مقدمہ“ سے ملاحظہ فرمائیے۔ حافظ ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ شرح ترمذی (ق: ۳/۱۱۳) میں فرماتے ہیں:

‘وَقَدْ بَرَّأْنَا ذِكْرَهُ مُسْلِمٌ (بمعنی الصحیح) لِمَقْتَضِي اَنْ لَا تُرْوَى اَحَادِيثُ الشَّرْعِيْبِ اِلَّا عَنِ تَرْوِي عِنْدَ الْاَحْكَامِ۔‘

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی ”صحیح“ کے مقدمہ میں ظاہراً یہ مسلک بیان کیا ہے، کہ ترغیب و ترہیب (فضائل اعمال) میں بھی صرف وہ احادیث روایت کی جائیں جو احکام میں روایت کی جاتی ہیں۔ یعنی محدثین کا اختلاف ضعیف حدیث کی صرف روایت میں ہے۔ اس کے اعتبار نہ کرنے پر سب متفق ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ کا بعض اعمال میں تسامح روایت کی حد تک ہے۔

غور فرمائیے! اس دور میں جب کہ احادیث کی تدوین مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اگر احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ بعض شرائط کے تحت ضعیف احادیث کی روایت بھی روا نہ رکھتے، تو آج ہم



بہت سی ایسی ضعیف روایات سے محروم رہ جاتے جو شواہد اور توابع کی بناء پر مفید ہوتیں۔ خصوصاً جب کہ حدیث حسن بھی اس دور میں ضعیف کی قسم شمار ہوتی تھی، حالانکہ حسن قابل اعتماد ہے۔ یہ وضاحت ہم پہلے تبصرہ میں بھی کر چکے ہیں۔

محدثین کا اختلاف بیان کرنے کے ساتھ مناسب ہو گا کہ یہ بھی بیان کر دیا جائے کہ ضعیف سے استحباب پر استدلال کن لوگوں کا مسلک ہے اور اس بدعت کی ایجاد کا باعث کیا ہے؟

ہم پہلے ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے یہ نقل کر چکے ہیں، کہ پوری امت کا ضعیف حدیث کے ناقابل اعتبار ہونے پر اجماع ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے، کہ اہل الحدیث کے علاوہ اہل الرائے بھی ضعیف حدیث کو ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں، لیکن دور تقلید و انحطاط میں جب مسلک کو ضعیف احادیث سے تائید دینے کی جزبی صورتیں پیش آئیں، تو متعصبین نے بعض اصول ایجاد کیے جن میں سے ایک یہ تھا، کہ ضعیف حدیث کے مطابق ان کے امام کا عمل مل جائے تو ایسی حدیث قابل عمل سمجھی جائے گی۔ پھر جب اس اصول کا استعمال معرض استدلال میں ہوا تو اس نے یہ شکل اختیار کی کہ ضعیف حدیث سے استحباب ثابت ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں باتیں بعض متاخرین اہل الرائے کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ اگرچہ ان کی تائید کے لیے انھوں نے متقدمین اہل الرائے یا بعض محدثین سے حسب منشاء استنباطات کی کوشش کی ہے، لیکن احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ کے مسلک کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

اب ہم بعض محدثین کی ضعیف احادیث کی روایت اور شرائط پر گزارشات پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب ضعیف نے ”تدریب الراوی“ کے حوالہ سے چند شرط کا ذکر کیا ہے۔ یہ شرط اگرچہ طالبان حدیث کے ہاں معروف ہیں، لیکن ان شرط سے ذہول بہت عام ہو چکا ہے۔ میں شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے کلام اور اس کے مضموم کے لیے، ان کے شاگرد خاص حافظ سخاوی رحمہ اللہ کی کتاب ”القول البدیع فی الصلوٰۃ علی الحجیب الشفیع“، ص: ۲۵۸ طبع مدینہ منورہ، کے حوالہ سے نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

’وَقَدْ سَمِعْتُ شَيْخًا مَرَّارًا يَقُولُ: وَكَلِمَةٌ بِلِيٍّ عَنِ: أَنَّ شَرَايِطَ الْعَمَلِ بِالضَّعِيفِ ثَلَاثَةٌ: الْأَوَّلُ مُتَّقِنٌ عَلَيْهِ، أَنْ يَكُونَ الضَّعْفُ غَيْرَ شَدِيدٍ فَيُخْرُجُ مِنَ الْفَرْوِ مِنَ الْكَدِّ بَيْنَ، وَالثَّمِينِ بِالْكَذِبِ، وَفُحْشِ غَلَطٍ. الثَّانِي أَنْ يَكُونَ مُدْرَجًا تَحْتَ اَصْلِ عَامٍ فَيُخْرُجُ بِمَخْتَرَعٍ يَحْتَمِلُ أَنْ لَا يَكُونَ لَهُ اَصْلٌ صَحِيحًا. الثَّلَاثُ: أَنْ لَا يُعْتَقَدَ عِنْدَ الْعَمَلِ بِهِ مُبَوِّدًا لِمَا يُنْسَبُ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ أَلَمْ يَقُلْ:‘

”ہم نے اپنے استاذ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے کئی بار سنا، اور انھوں نے مجھے اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیا، کہ ضعیف حدیث پر عمل کے لیے تین شرطیں ہیں۔ پہلی جس پر اتفاق ہے، یہ ہے کہ ضعف شدید نہ ہو، ہاں کہ جھوٹوں اور جھوٹ کے ساتھ متہم، اور جن سے روایت حدیث میں بڑی غلطیاں ہوں، سے احتراز ہو جائے۔ دوسری یہ ہے، کہ وہ حدیث ایک عام اصل کے تحت ہو، تاکہ جس حدیث کا کوئی اصل صحیح ثابت نہ ہو۔ اس سے بچا جاسکے۔ تیسری شرط یہ ہے، کہ اس حدیث پر عمل کرتے وقت اس کے سنت ہونے کا عقیدہ نہ ہو۔ کیونکہ اس طرح رسول اللہ ﷺ کی طرف وہ بات منسوب ہو جائے گی، جو آپ ﷺ نے نہیں فرمائی۔“

ان شرائط کی علیحدہ علیحدہ تشریح بھی پیش خدمت ہے۔ پہلی شرط کا معنی یہ ہے، کہ ضعیف حدیث پر عمل کے لیے حدیث کی حالت کی واقفیت ضروری ہے۔ ہاں کہ شدید ضعف سے بچا جاسکے۔ اس شرط کو پیش نظر رکھ کر غور فرمائیے کہ ہمارے ہاں آج وہ لوگ کتنی تعداد میں ہیں، جو احادیث کی صحت کے معیار کو سامنے رکھ کر گفتگو کر سکیں۔ (ساتویں صدی ہجری کے امام حدیث حافظ ابن الصلاح اس فن میں لوگوں کی کمزوری دیکھ کر تو یہ رائے رکھتے ہیں کہ اب کسی حدیث پر نئے سرے سے صحت اور ضعف کی تحقیق مشکل ہے۔ اس لیے ہمیں متقدمین حدیث کی تصحیح و تضعیف پر اکتفاء کرنا چاہیے۔ یہاں سے کسی کو تقلید کا وہم نہ پڑے۔ کیونکہ واقعات کی تحقیق اور ان کی صحت و ضعف قریبی دور میں ممکن ہوتا ہے۔ لمبا عرصہ گزرنے کے بعد کسی واقعہ کی مستقل برآہ (براہ راست) تحقیق بڑی مشکل ہوتی ہے۔ نیز تقلید کا تعلق درایت فقہی سے ہے روایت سے نہیں ہے۔ جیسا کہ علمائے امت نے وضاحت کی ہے۔)

خصوصاً احوال رواۃ کے سلسلہ میں جب مختلف ائمہ کی طرف سے جرح و تعدیل کا اختلاف ہوتا ہے، تو اس میں ترجیح دینا کتنا مشکل امر ہے۔ بجایہ کہ راوی کی عدالت اور ضبط کی باریکیوں کو سامنے رکھ کر معیار حدیث کے متعلق کوئی پختہ رائے قائم کی جائے۔ ہم یہ نہیں کہتے، کہ یہ کام ناممکن ہے۔ لیکن یہ بات ماننی پڑے گی، کہ اس معیار کا فیصلہ کر سکنے والے بہت کم لوگ ہوں گے۔ نتیجتاً ضعف شدید اور ضعف خفیف کا امتیاز مٹ جائے گا اور بیشتر دفعہ ضعف شدید نظر انداز کر دیا جائے گا۔

دوسری شرط کا معنی یہ ہے، کہ ضعیف حدیث میں مذکور مسئلہ کا اصل صحیح حدیث سے ثابت ہو۔ مثلاً کوئی عمل اصلاً تو صحیح حدیث سے مشروع ہے۔ لیکن اس پر ثواب کا ذکر





ضعیف حدیث میں آیا ہو۔ غور فرمائیے! کہ بات عمل کی ہو رہی تھی اور عمل صحیح حدیث سے مشروع ہے۔ حالانکہ ثواب کا تعلق انسان سے نہیں، وہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ضعیف احادیث پر عمل سے کیا فرق پڑا؟ اصل عمل تو صحیح حدیث پر ہے۔ ضعیف پر نہیں۔

تیسری شرط کا مطلب یہ ہے، کہ ضعفِ خفیف کے باوجود اس مسئلہ پر عمل کرتے وقت اس کے شرعی ہونے کا عقیدہ نہ رکھے، کیونکہ شرع کے ثبوت کے لیے رسول اللہ ﷺ سے نقل صحیح اور ثبوت ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا شرائط سے نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ صحیح حدیث کے علاوہ ضعیف پر عمل جائز نہیں۔ البتہ مخالف جانب کے لحاظ سے ایسا ممکن ہو گا کہ بعض ان ضعف والی احادیث پر جن میں ظاہراً ثواب کا ذکر ہے۔ لیکن مسئلہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ ضعیف احادیث پر عمل کا وہم پڑے گا۔ حالانکہ وہاں اصل عمل صحیح حدیث پر ہوگا۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی جو عبارت پہلے گزر چکی ہے جس کے متعلق ہم نے وعدہ کیا تھا، کہ اس کی وضاحت ہم شروط کی بحث میں کریں گے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ وہاں ایسی شروط کا لحاظ رکھ کر امام احمد رحمہ اللہ کی رائے کی وضاحت کر رہے ہیں۔ لیکن ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی رائے میں امام کے نزدیک ایسی شرائط کا تعلق روایت حدیث سے ہے عمل حدیث سے نہیں۔ اس لیے روایت حدیث کی صورت میں ان شرائط کا لحاظ یا صرف صحیح حدیث پر عمل کی رائے رکھنا ایک ہی معنی رکھتا ہے۔

ہمارا دل چاہتا ہے، کہ محدثین کا طریق روایت اور روایت میں صحت و ضعف کے اعتبار کے لحاظ سے ان کے عمل پر بحث کریں اور یہ بتائیں کہ وہ کسی نہ کسی انداز میں روایت کرتے وقت بھی صحت اور ضعف کی نشاندہی ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے لیے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔ اس لیے ہم اس نکتہ کو چھوڑے دیتے ہیں۔ ہم اپنی گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے اپنے استاذ شیخ ناصر الدین البانی، جن کے بارے میں حضرت مولانا عطا اللہ صاحب کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ وہ شروط بالاکافی اس توجیہ سے اختلاف نہیں کریں گے کہ ضعیف حدیث قابل عمل ہو سکتی ہے، کے مسلک کی وضاحت ان کے کلام سے کیے دیتے ہیں۔ چنانچہ استاذ محترم کی کلام بلغظہ ملاحظہ فرمائیے:

’وَمُحَمَّدٌ الْقَوْلُ إِنَّمَا نَفَّحُوا نَفْسَهُ فِي مَشَارِقِ الْأَرْضِ، وَمَغَارِبِهَا أَنْ يَدْعُوا الْعَمَلُ بِالْأَحَادِيثِ الضَّعِيفَةِ مُطْلَقًا - وَأَنْ يُؤْتُوا بِمَشْمُومٍ إِلَى الْعَمَلِ بِمَا ثَبَتَ مِنْهَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ - فَيُضَاهَا بِمَعْنَى عَنِ الضَّعِيفَةِ - وَفِي ذَلِكَ مُجَاوِزٌ مِنَ الْوُقُوعِ فِي الْكُذْبِ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، لِأَنَّنا نَعْرِفُ بِالْتَّجْرِيَةِ أَنَّ الَّذِينَ سَخَّطُوا فِي بَدَا، قَدْ وَقَعُوا فِي مَا ذَكَرْنَا مِنَ الْكُذْبِ، لِأَنَّهُمْ يَعْمَلُونَ بِكُلِّ مَا ثَبَتَ مِنْ الْحَدِيثِ - وَقَدْ أَسْرَارَ (صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) إِلَى بَدَا بِقَوْلِهِ: كَفَى بِالْمَرْءِ كُذْبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ - رَوَاهُ مُسْلِمٌ فِي مَقَدِّمَتِهِ صَحِيحًا - وَعَلَيْهِ أَقُولُ: كَفَى بِالْمَرْءِ ضَلَالًا أَنْ يَعْمَلَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ -‘

ہم مشرق و مغرب میں اپنے مسلمان بھائیوں کو نصیحت کرتے ہیں، کہ وہ ضعیف احادیث پر عمل کو کلی طور پر ترک کر دیں اور اپنی ہمتوں کو صرف انہی احادیث پر مرکوز کر دیں، جو نبی علیہ السلام سے ثابت ہیں۔ ان میں وہ چیز موجود ہے جو ضعیف احادیث سے انسانوں کے لیے کافی ہو اور اس میں نجات ہو۔ چہ جائیکہ انسان رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ کا ارتکاب کر بیٹھے، کیونکہ ہم تجربہ کی بناء پر جانتے ہیں کہ جو لوگ اس میں مخالفت کرتے ہیں، وہ کذب میں واقع ہوئے ہیں، کیونکہ وہ ہر قسم کی غث و سمین پر عمل کے عادی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اسی طرف اشارہ فرماتے ہیں، کہ انسان کے لیے یہی جھوٹ کافی ہے، کہ وہ ہر سنی بات بیان کر دے اور میں کہتا ہوں۔ یہی گمراہی کافی ہے، کہ آدمی ہر سنی بات پر عمل کرے۔

خلاصہ کلام یہ ہے، کہ محققین علمائے امت اس بات پر متفق ہیں، کہ شریعت اور اس کی جزئیات خواہ وہ عملی ہوں یا فضائل اعمال ان کا اعتبار اسی صورت میں ہو گا جب وہ رسول اللہ ﷺ سے بہ نقل صحیح ثابت ہوں۔ اگر کوئی چیز آپ ﷺ سے ثابت نہ ہو یا اس کی نسبت آپ ﷺ کی طرف ضعیف ہو، تو اسے مشروع نہیں سمجھا جائے گا۔ کیونکہ یہ وعید بالفاظ تو اترا ثابت ہے: ’مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَدًّا فَلْيَبْغُوا مَقْتَهُ مِنْ النَّارِ‘ صحیح البخاری، باب ’ثُمَّ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، رقم: ۱۰۰۰‘ یعنی جو شخص رسول اللہ ﷺ پر قصداً جھوٹ بولے۔ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔ آپ ﷺ پر جھوٹ کی ایک شکل یہ ہے، کہ کسی بات کے بارے میں آپ ﷺ کی نسبت اعتماد نہ ہو، کہ وہ آپ ﷺ ہی کا قول و فعل اور تقریر ہے اور وہ یقینی صیغوں سے آپ ﷺ کی طرف نسبت کی جائے۔

ضعیف حدیث کے بارے میں کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ لہذا اس کی اتباع کی صورت میں ظن مرجوح پر عمل لازم آئے گا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت فرمائی ہے: **ان يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (النجم: ۲۸) (واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين)**

هذا ما عندي والله اعلم بالصواب



## فتاوى حاقظ ثناء التمدنى

كتاب الصلوة: صفحہ: 444

محدث فتوى